

## بحث و نظر

# اسلام اور جاہلیت کی کشمکش

مولانا صدر الدین اصلاحی

## انسان کا امتیازی وصف

نوع انسانی کا وہ امتیازی جوہر جو اسے قدرت کی ایک شاہ کار مخلوق بناتا ہے دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے، اس کی عقل ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اسے اپنے اعمال و حرکات کے سلسلے میں جواب دہ اور مستحق جزا و سزا ٹھہراتی ہے۔ اگر کسی کے اوپر کوئی چٹان لڑھک کر گر پڑے اور اسے زخمی کر دے یا جان سے مار دے تو کوئی بھی اس چٹان کو مجرم نہیں قرار دیتا۔ کیونکہ وہ عقل اور شعور سے عاری ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مویشی کسی کی کھیتی چر ڈالے اور اس کو روند کر رکھ دے تو اسے مجرم ٹھہرا کر اس پر کوئی فرد مجرم عائد نہیں کی جاتی۔ کیونکہ گودہ شعور اور احساس رکھتا ہے مگر عقل خرد نہیں رکھتا۔ لیکن ضرر رسائی کی ایسی ہی کوئی حرکت جب کسی آدمی سے سرزد ہوتی ہے تو قانون اور مذہب، سلج اور حکومت سب اسے اپنے اس فعل کا ذمہ دار اور جواب دہ سمجھتے اور لائق توبہ و جزا قرار دیتے ہیں۔ صرف اس بنا پر کہ وہ شعور بھی رکھتا ہے اور عقل بھی، دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان کے ایک ذمہ دار مسئول اور مستحق جزا یا لائق سزا ہستی ہونے کی تمام تر وجہ اس کی عقل و فہم ہے۔

عقل کی نامردیاں | لیکن انسان کے ایک صاحب فہم و عقل ہستی ہونے کے معنی ہرگز

یہ نہیں ہیں کہ اس کا ہر کام لازماً عاقلانہ ہی ہوا کرتا ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے عقل و خرد کی ترازویں ٹھیک ٹھیک تول کر ہی کرتا ہے۔ ایک طالب علم اپنا بیشتر وقت تفریحوں میں گزارتا رہتا ہے جبکہ دوسرا اپنے تعلیمی فرائض کی انجام دہی میں لگا رہتا ہے۔ انسان ہونے کے باعث صاحب عقل ہستی دونوں ہی ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی شخص دونوں کو یکساں طور پر اپنی عقل کا صحیح استعمال کرنے والا نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح کے تضاد کرداروں کی مثالیں واقعات کی دنیا میں ہر طرف موجود دیکھی جاسکتی ہیں، جو اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ انسان اپنی اس امتیازی قوت کے صحیح استعمال میں جہاں کامیاب رہتا ہے وہاں ناکام بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اور شواہد بتاتے ہیں کہ اس کی ناکامیوں کی نہرست کامیابیوں کے مقابلے میں کم طویل نہیں ہے۔ پھر بات اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی عقل کے صحیح استعمال میں ناکام ہوتا رہتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ بسا اوقات وہ اس کا استعمال ہی نہیں کرتا، حتیٰ کہ اس کی سنی ان سنی ایک کر دیتا ہے۔ کتنے ہی شرابی، جواری، رہزن اور فحش کار آپ ایسے ہر جگہ پا اور دیکھ سکتے ہیں جو دل میں اپنے فعل کو خود بھی نادرست ہی سمجھتے ہوں گے، مگر پھر بھی کسی نہ کسی وجہ سے وہ اس کا ارتکاب کے مجاہدے ہوں گے۔ اس جو حقیقت روشنی میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی عقل قوت کا استعمال ہمیشہ نہیں کیا کرتا، اور جب کرتا ہے تو ضروری نہیں ہوتا کہ وہ صحیح بھی ہو، اور اگر وہ صحیح ہو بھی تو لازمی نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے پر عمل بھی کرے۔

جب معمولی معمولی کاموں کے سلسلے میں عقلِ انسانی کے استعمال اور اس کی شنوائی کا پیمانہ ہے تو خدا اور مذہبِ عیبیہ اور الٰہی سلسلے کے بارے میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا؟ دو پیسے کی امانت میں خیانت سے باز نہ رہنے والوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ایک لاکھ کی امانت میں سچے امین ثابت ہوں گے، بڑی سادہ لوحی کی بات ہوگی جو انسان اپنے مرغوب دنیوی مفادات کے بارے میں بھی صحیح فیصلوں تک پہنچنے میں ناکام ہو جایا کرتا ہے، حتیٰ کہ صحیح فیصلے سوچھ جانے کے بعد بھی کسی وجہ سے ان کے مطابق عمل درآمد کرنے کی توفیق نہیں پاتا وہ اپنی عقل و فہم سے خدا اور اس کے دین کے معاملے میں دس فیصد بھی اگر صحیح فیصلے حاصل کر سکے اور پھر ان دس میں

دو ایک کو بھی عملات تسلیم کر لے سکے تو بہت بڑی بات ہوگی۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ تاریخ کا کوئی باب بھی مذہبی اختلافوں اور تصادموں کے تذکرے سے خالی نہیں ہے تو یہ دراصل عقل و دانش کو کبھی غلط استعمال کرنے، کبھی استعمال ہی نہ کرنے اور کبھی اس کے کہنے کو جان بوجھ کر ٹھکرا دینے کا ہی نتیجہ ہے۔

## عقل اور فطرت کے حجابات

یہ پہلا جیسی غلطی انسان سے کیوں سرزد ہوتی رہتی ہے؟ اپنی سب سے قیمتی متاع، عقل اور فطرت تسلیم کے ساتھ اس نے اس ظلم کو کیسے روا رکھا، یہ ایک بڑا اہم سوال ہے جو اس موقع پر لازماً ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اس کا جواب معلوم کر لیا جائے۔

یوں تو اس غلطی اور اس ظلم کے اسباب و عوامل متعدد ہیں، اور بہت سی چیزیں ہیں جو دین و مذہب کے سلسلے میں آدمی کی عقل پر اور اس کی خیر پسند فطرت پر پردے ڈال دیا کرتی ہیں۔ لیکن ان میں سے تین ہی عوامل ایسے ہیں جن کا رول اس معاملے میں بنیادی ہوا کرتا ہے۔

۱۔ پہلا بنیادی اور نمایاں سبب تو آدمی کی جمالی ضرورتیں اور طبعی خواہشیں ہیں۔ یہ خواہشیں بڑی طاقت ور اور زندہ درواریہ ہوتی ہیں۔ اگر انسان انھیں قابو میں نہ رکھ سکے، اور بالعموم ایسا ہی ہوتا بھی ہے، اور انھیں آزاد چھوڑ دے تو وہ بالکل بے لگام ہو رہتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے اندر کسی ایسے عمل اور اقدام کی ہمت، بلکہ اس کا ارادہ تک باقی نہیں رہنے دیتیں جو انھیں گوارا نہ ہو۔ اور جب آدمی کسی اچھے کام کے کرنے کا ارادہ بھی کر سکنے کے قابل نہ رہ گیا ہو تو چاہے اس کی عقل کا کہنا کچھ بھی ہو اس پر وہ کان بھی نہیں دھر سکتا۔ دوسرے نطفوں میں یہ کہ وہ اپنی عقل سے کام لینے میں ناکام رہتا ہے شراب کا رسیا خوب جانتا ہے کہ یہ ام النجاشت اس کی صحت، اس کی دلالت اس کا ذہنی اعتدال اور اس کی اخلاقی پاکیزگی، سب کو چاٹنے لے رہی ہے، مگر ان ساری تباہ کاریوں کو آنکھوں دیکھتے ہوئے بھی وہ دل کے ہاتھوں مجبور بنا رہتا ہے اور عقل غریب

کی ایک سن کر نہیں دیتا۔ یہ امر واقعی اس حقیقت کی زندہ مثال ہے۔

۲۔ دوسرا بڑا سبب قومی تعصب، باپ دادا کی اندھی تقلید، موروثی افکار و عقائد اور رسوم و رواج سے گہری وابستگی ہے۔ آدمی معقول سے محقول بات کو بھی محض اس بنا پر حقارت سے ٹھکرا دیا کرتا ہے کہ وہ 'باہر' سے آئی ہوئی ہے اور اس کے اپنے قدیم ماضی کی مخالفت ہے۔ گویا اس کے سوچنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کے اپنے ہاں کی ہو وہی صحیح اور قابلِ التفات ہے، اور اس کی قومی عزت و عظمت کا تقاضا ہے کہ اسے ہر حال میں دانتوں سے پکڑے رہے۔ یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہو گی کہ وہ اس کے غلط اور قابلِ ترک ہونے کا تصور بھی دل میں لائے۔

۳۔ تیسرا عام اور وسیع و عالم گیر سبب فکر و نظر کی خامی ہے۔ ایسے لوگ کثرت سے ہر طرف موجود دیکھے جاسکتے ہیں جو دین کے سب سے اہم اور سب سے نازک مسئلے پر غور و فکر کرتے بھی ہیں تو غور و فکر کا حق ادا نہیں کرتے۔ ان کے سوچنے کا ڈھنگ سطحی اور بے تکا ہوتا ہے اور ان کے استدلال میں پھسپھسا پن اور بھینگنا پن کام کر رہا ہوتا ہے۔ چند قدم چلے نہیں کہ غلط رخ پر مڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ خدا کو بھی ملتے ہیں گے اور آخرت کے محاسب کو بھی تسلیم کرتے ہوں گے۔ مگر اس ماننے اور تسلیم کرنے کی تفصیل میں جانے کے بعد ان کا یہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہو کر رہ جاتا ہو گا۔ تکنیکی حیثیت سے تو وہ ساری عظمتوں کا مالک اللہ رب العالمین ہی کو سمجھتے ہوں گے، ماسی کو ساری کائنات کا خالق اور پروردگار، آقا و حکم ماننے ہوں گے، مگر اس کی تشریحی حیثیت کا سوال سامنے آتے ہی اسے عرش سے اتار کر فرش پر لایٹھاتے ہوں گے، اور اسے کبھی دنیا کے حکم رانوں پر قیاس کر کے 'شُرک' کی گندگی میں جاگرتے دکھائی دیں گے، اور کبھی اس کی ذات واجب الوجود کو فانی مخلوقات پر قیاس کر کے 'تشبیہ' کی گمراہی میں جا پڑتے نظر آئیں گے، حالانکہ ان میں سے ہر قیاس بدستہ قیاس مح الفلق ہوتا ہے۔

یہی حال ان کے نام نہاد ایمان بالآخرت بھی ہو گا۔ قیامت، آخرت اور محاسبہ اعمال

کو تسلیم کرنے کا انھیں دعویٰ بھی ہوگا، مگر ساتھ ہی کچھ مستیوں کی شفاعت کے بل پر بہر حال پروا نہ  
مغفرت حاصل کرنے کا من مانا عقیدہ بھی رکھتے ہوں گے، جس کے بعد آخرت اور اس کے محاسبے  
پر ایمان رکھنے کے کوئی معنی ہی نہیں باقی رہ سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے لفظوں میں پہلے سبب کا نام وحجاب طبع، یا حجاب نفس، دوسرے  
کا حجاب رسم، اور تیسرے کا حجاب سبب معرفت ہے۔

عقل انسانی کے ان حجابات میں سے کسی کی بھی کارستانیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بنی  
آدم کی بہت بڑی اکثریت انہی حجابات کی تاریکیوں میں گم، اور ان کی پیدا کی ہوئی محدود میوں  
کا شکار بنتی چلی آ رہی ہے۔ غیر دینی معاملات سے تو انھیں کوئی خاص غرض نہیں ہوتی، مگر خدا  
اور مذہب کے معاملے میں وہ آدمی کے دل و دماغ پر کالی گھٹا بن کر چھا جایا کرتے ہیں، اور پھر  
ایسا بہت کم ہونے پاتا ہے کہ وہ چھٹ جایا کریں الا لمن یشاء اللہ۔

## مذہب کی تقسیم

یوں تو دنیا میں بے شمار مذاہب پائے جاتے ہیں، مگر دیانت اور صداقت کی کسوٹی پر اگر  
کس کو دیکھا جائے تو وہ دو ہی قسموں میں منقسم نظر آئیں گے: صحیح اور برحق مذہب، اور غلط  
و ناحق مذہب۔ صحیح اور برحق مذہب تو ایک ہی ہے، اور ایک ہی ہو سکتا ہے، جب کہ غلط  
اور حق سے بڑے ہوئے مذہب متعدد ہیں اور یہ اس لئے کہ ان میں سے جو مذہب عقل و  
دانش کے صحیح فیصلہ کے مطابق ہوگا اسی کو برحق کہا جاسکے گا، اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت  
ہے کہ عقل و دانش کا صحیح فیصلہ ایک ہی ہو سکتا ہے جب کہ اس کے غلط استعمال کے لئے  
ہوئے فیصلے بہت سے ہو سکتے ہیں۔

یہی ایک صحیح و برحق مذہب ہے جسے اسلام، کہتے ہیں۔ اس کے سوا جو کچھ ہے،

جتنے مذاہب اور نظامہائے فکر و عمل ہیں ان سب کی تعبیر کے لئے ایک جامع لفظ 'جاہلیت' ہے۔ جاہلیت کا لفظ سن کر کان نہ کھڑے کرنے چاہئیں، نہ برا ماننا چاہئے۔ یہ اسی ایک سچے مذہب اسلام کی ایک اصطلاح ہے، اور اس سے مراد مذہبی یا اخلاقی نوعیت کی ہر وہ چیز اور طور طریقہ ہے جس کا سرچشمہ اللہ کا دین، یعنی اسلام نہ ہو۔ ایسی ہر چیز کو جاہلیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد، کم از کم اسلام کی نگاہ میں، اللہ تعالیٰ کی کسی ایسی ہدایت اور وحی پر نہ ہوگی جو بے آمیزاہد عند اللہ پسندیدہ ہو۔ بلکہ براہ راست یا بالواسطہ، اس کے ماننے والوں کے اپنے جذبات اور اپنی ذاتی پسند پر ہوگی، اور عربی زبان و ادب کی رو سے اسی اتباع جذبات کا نام جاہلیت ہے۔

### جاہلیت کی دین بیزاری اور دنیا نوازی

جاہلیت کے اندر نشوونما اور ارتقاء کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ مسلسل ترقی کرتی اور انسانی ذہن میں مضبوطی سے جتنی چلی جاتی ہے۔ اور جوں جوں اس کے اندر وسعت اور گہرائی آتی جاتی ہے، عقل صحیح اور فطرت سلیم سے اس کی دہری برہمتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت چل کر وہ آدمی کے ذہن سے اس تصور کو بھی نکال باہر کرتی ہے کہ وہ انسان ہے، اور یہ باور کرا دیتی ہے کہ وہ بس اونچے درجے کا ایک حیوان ہے۔ اور یہ خیال ایسا خیال تو ہوتا ہے جس کے بطن سے مادیت، عشق دنیا، خود غرضی، لذت پرستی، ظلم، سرکشی، استکبار اور فساد فی الارض جیسی برائیوں کے سوا اور کچھ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ انانیت کی حد یہ ہوتی ہے کہ یہ انسان نامخلوق من ہوا شد مننا قوۃ کا لغزہ بلند کرنے سے بھی باز نہیں رہتی۔ اور اگر اس جذبہ انانیت

۱۰ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے 'جاہلیت' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے اور بالکل صحیح بیان کیا ہے۔  
 "ہر وہ کام جاہلیت کا کام ہے جسے لوگوں نے اختیار کر رکھا تھا لیکن اسلام نے اسے برقرار نہیں رکھا۔ بس امور جاہلیت میں وہ ساری چیزیں داخل ہیں جنہیں لوگ اپنائے ہوئے تھے اگرچہ اسلام نے ان کا نام لے کر ان سے منع نہ کیا ہو" (افتاء الصراط المستقیم ص ۵۵)

نے مذہبی بھیس میں ظہور کرنے کی سوچی تو اللہ رب العالمین تک کو چیلنج دے دیتی ہے اور اسے بزمِ خوشی، کائنات کی فرماں روائی سے معزول کر کے اَنَا رَبُّكُمْ عَلٰی مَا اَعْلٰنُ کر دیتی ہے۔

ابھی جو یہ واضح کیا جا چکا کہ جاہلیت سے مراد ہر وہ مذہبی یا اخلاقی نوعیت کا کام یا عمل یا طور طریقہ ہے جس کا سرچشمہ اسلام نہ ہو، اس سے اس سوال کے اٹھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ جب جاہلیت عقل کے غلط استعمال کا یا عدم استعمال کا نام ہے تو ان قوموں کو دنیوی اور تمدنی حیثیت سے بھی انتہائی پسماندہ ہونا چاہئے جو اسلام کے بقول جاہلی توبیں ہوں۔ 'مذہبی نوعیت' کی قید اس سوال کو بالکل خارج از بحث قرار دے دیتی ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف کھلا اشارہ کر دیتی ہے کہ یہ جاہلیت وہ 'جاہلیت' ہے جس کی مار آدمی کی اس سوچ بوجھ پر نہیں پڑا کرتی جس کا تعلق دنیا کے معاملات و مفادات سے ہوتا ہے بلکہ عقل انسانی کی کارکردگی کے صرف اخلاقی رخ پر حملہ کرتی ہے، اس کے طبعی اور مادی رخ سے تعرض نہیں کرتی۔ کیونکہ انسان کا مادی ترقی کی سمت میں بڑھنا اس کے مقصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا، بلکہ بالعموم معاون و مددگار ہی بنا کرتا ہے اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ انسان کو جس قدر زیادہ معاشی، تمدنی اور سیاسی عروج حاصل ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کا رشتہ خدا اور آخرت، دین اور اخلاق سے عموماً کم زور پڑتا جاتا ہے۔ اور یہی جاہلیت کو مطلوب ہے۔ پھر وہ لوگوں کی دنیوی ترقی کی راہ میں بھی مزاحم کیوں بنے۔ جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قومیں جہاں اخلاقی اور روحانی حیثیت سے ہاتھ ہوتی ہیں وہاں دنیوی اور مادی حیثیت سے بڑی عاقل اور زرخیز، بھی ہو سکتی ہیں، ہوتی رہی ہیں، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی چنانچہ جن جاہلیت زدہ قوموں کی اخلاقی موت کی داستانیں ابھی آگے آ رہی ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر اپنے اپنے زمانوں کی نہایت ترقی یافتہ قومیں رہی ہیں۔ عادات اور رسوم کے متعلق قرآن مجید کا بیان ہے کہ جہاں وہ اخلاق اور دین کے معاملے میں اندھے پن کی انتہاؤں پر پہنچے ہوئے تھے وہاں دنیا اور اس کے معاملات کے سلسلے میں بڑی سوچ بوجھ رکھتے تھے۔ (وَكَاوُا مُسْتَبْصِرِينَ۔

عنکبوت۔ ۳۸) قوم عاداتی زور آور اور باجبروت تھی کہ دنیا نے اب تک ایسی قوم دیکھی  
 نہ تھی، اور تمدنی شان و شوکت بھی اس کی بے مثال تھی (اسم ذات الجہاد النبی لم یخلق  
 مثلها فی البلاد۔ فریح نیز فوجی طاقت کے لحاظ سے اپنے عہد کی دوسرے پارے تھی) (وَ اِذَا  
 بَطَشْتُمْ بَطْشَتُمْ جَبَابِرَیْنِ شَرَّۃً ۱۳) قوم ثمود کی بابت قرآن بتاتا ہے کہ وہ بھی اپنے  
 دور کی انتہائی ترقی یافتہ قوم تھی۔ علم و فن، خصوصاً فنِ تعمیر میں کمال کے درجے تک پہنچی ہوئی  
 تھی۔ میدانی علاقوں میں اس نے شاندار محل، اور کوہستانوں میں پہاڑوں کو تراش کر بڑے  
 بڑے مکان اور قلعے تعمیر کر رکھے تھے۔ (تَتَّخِذُونَ مِنْ سُھُوبِهَا قُصُورًا وَّ  
 قَدْحَاتٍ مِنَ الْجِبَالِ یُبۡوِنٰتُا۔ اعراف۔ ۷۴) قوم شعیب تجارت کے میدان کی شہسوار  
 تھی اور اپنی کوششوں اور شاطرانہ چالوں سے اپنے کاروبار کو بام عروج پر پہنچائے ہوئے  
 تھی۔ قوم ذرعون کا جاہ و جلال دنیا پر روشن ہی ہے۔ قریش مکہ ایک طرف عرب کے برہمن  
 بنے ہوئے تھے تو دوسری طرف بحرِ احمر کے کنارے گزرنے والی بین الاقوامی تجارتی  
 شاہراہ کے گویا تنہا مالک تھے۔ یہ ساری شہادتیں اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ جاہلیت  
 کو اگرچہ عقلِ انسانی کے اخلاقی رجحانات سے انتہائی بیرہے مگر اس کا مادی رجحان اور ذہنی  
 معاملات میں اس کی کارکردگی نہ صرف یہ کہ اسے ناپسند نہیں بلکہ بڑی محبوب ہے۔

## اسلام اور جاہلیت کی دائمی کشمکش

اختلاف خصوصاً دینی افکار کے سلسلے کے اختلاف کا یہ مزاج ہی نہیں کہ اپنی حمد میں  
 خاموشی کے ساتھ سمٹتا رہے۔ اس کے بخلاف یہاں ہر فرقہ کی زبردست خواہش اور مسلسل کوشش  
 رہتی ہے کہ وہ مخالف کو زیر کر لے۔ اس لئے غیر دشر اسلام اور جاہلیت میں شروع ہی سے  
 ایک کشمکش برپا رہے، جو نہ کسی ختم ہوئی ہے نہ کسی ختم ہونے والی ہے، مگر نے کو تو شرعِ جاہلیت کے مختلف نظریات  
 اور مکاتبِ فکر بھی باہم ٹکراتے رہتے ہیں، مگر ان کا ٹکراؤ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کی  
 باہمی آویزش سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ یہ آویزش اکثر اوقات صلح و  
 مسالمت میں بھی بدل جایا کرتی ہے۔ مگر اسلام اور جاہلیت کا ٹکراؤ ایسا ٹکراؤ ہے جو ناپید انکار



ہے۔ یہ کبھی بقائے باہم کی سورج ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ان دونوں کی باہمی جنگ سب سے زیادہ کھلی ہوئی، سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ سخت و شدید ہوتی ہے۔ دنیا کا سارا منہ گامہ بڑی حد تک انہی دونوں سپیدالشی حرلیفوں، اسلام اور جاہلیت کی کشاکشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ایسی ضد واقع ہوئی ہیں کہ ایک کی زندگی دوسرے کی موت کا نام ہے۔ جس طرح رات کی فطری تاریکی کسی ایک ذرے پر بھی سورج کی کرنوں کا پرتو گوارہ نہیں کر سکتی، اور جس طرح سورج کی تیز لگاہیں کسی گوشے میں بھی تاریکی کے کسی دھبے کو باقی نہیں دیکھ سکتیں، ٹھیک اسی طرح عالم باطن کی روشنی اور تاریکی بھی ایک دوسرے کی جالی دشمن ہیں اور ان کے درمیان مصالحت کا کوئی امکان نہیں پایا جائے۔ باطل کی ہر ادھاق کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے، اور حق کی ہر آواز باطل کے لئے یکسر قابل نفرت قرار پاتی ہے۔

ان دونوں قوتوں کی اس دائمی کشمکش کا محور، انسان کی ذات ہے۔ ان میں سے ہر ایک اسے پوری طرح فتح کر لینا چاہتی ہے۔ اور ان کی ایسی کشمکش میں اس کی آزمائش ہو رہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر انہی کی باہمیت پر اس کی سعادت اور شقاوت موقوف رہتی ہے۔

## وحی الہی کی رہنمائی اور مدد

اسلام اور جاہلیت کی اس زبردست کشاکش کی منجھداری میں پڑے ہوئے انسان کو اس کے خالق اور پروردگار نے اپنے حال پر نہیں چھوڑ رکھا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نے اس آزمائش سے اس کے سرخ رو نکل سکے کے لئے تدبیروں اور کوششوں کا سارا بوجھ اس کی اپنی عقلی قوت اور فطری صلاحیت ہی پر ڈال رکھا ہو۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تب بھی انصاف کے خلاف نہ ہوتا۔ مگر یہ صرف مغشک، اور نرے قانونی انصاف کی بات ہوتی۔ ایسے انصاف کی بات نہ ہوتی جو اس خالق اور پروردگار کے رؤف و رحیم اور ہادی و حکیم ہونے کے شایانِ شان کہی جاسکتی۔ اس لئے اس کی مشیت کا بجا طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ وہ انسان کو اس آزمائش میں

کامیاب ہونے کے لئے عقل اور فطرتِ سلیم کے سوا کچھ اور بھی ہے، ایسی چیز دے دے جو اس کی عقل کو ہر بہکا دے، اور اس کی فطرت کو ہر بہلا دے سے بچ لینے والی ہو۔ یہی وہ چیز ہے جس کو وحی الہی کہتے ہیں۔ یہ وحی الہی انسان کی عقل کو روشنی دکھاتی اور اس کی فطرت کا تزکیہ کرتی ہے یہاں تک کہ اس کے اندر فرشتوں سے بھی بازی لے جانے کی طاقت پیدا کر دے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ خود اس کا طالب ہو۔ یہ وحی سراپا ہدایت ہوتی ہے، جو چوری دھمکت اور کامل صراحت کے ساتھ انسان کو تباہ اور بھادتی ہے کہ حق یعنی اسلام کی صراطِ مستقیم فی الواقع کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کی صورت، کیسی ہے؟ اس کے متعین تقاضے کیا ہیں۔ باطل یعنی جاہلیت سے اس کی سرحدیں کس کس طرح الگ ہوتی ہیں؟ اور اس کی پیری انسان کے لئے کیوں ضروری ہے؟ اس آسمانی ہدایت کا قبول کرنا یا نہ کرنا ہر شخص کی انہی آزاد مرضی پر موقوف ہے۔ کیونکہ اگر یہ آزادی انسان کو حاصل نہ ہوتی تو نہ صرف یہ کہ یہ سارا ہنگامہ حق و باطل سرد پڑ کر رہ جاتا، بلکہ انسان کے پیدا کئے جانے کا مقصد بھی فوت ہو رہتا جو کوئی اس رہنمائی کے قبول کر لینے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس فیصلہ کو عمل کی شکل دے دیتا ہے، وہ اس کی عقل کو 'فرقان' عطا کر دیتی اور اسے صحیح معنوں میں 'اُولُو الْاَلْبَابِ' (اہلِ بلاش) کے زمرہ میں شامل کر دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ جو کچھ سوچتا ہے ٹھیک رخ سے سوچتا ہے، جو کچھ کرتا ہے صحیح ڈھنگ سے کرتا ہے، اس کا ہر قدم صحیح ارتقار کا قدم ہوتا ہے، اور اس کی زندگی خوش کام نیک انجام زندگی بن جاتی ہے۔ اسی حقیقت واقعی کو سامنے رکھتے ہوئے اس رہنمائی کو اللہ رب العالمین کی سب سے بڑی نوازش ہی کہا جاسکتا ہے، جسے قرآن حکیم نے بالکل بجا طور پر 'رحمت' اور 'نعمتِ کاملہ' فرمایا ہے، لیکن جس کے ایک بڑے حصہ (ثلثیت) کو اسرائیلی نادانوں نے، اُس وقت جب ان پر دنیا پرستی اور خدا فراموشی کی موت طاری ہو گئی تھی، 'لعنت' قرار دے دیا تھا، اور آج تمدن اور روشن خیال دنیا اس سے بھی کچھ زیادہ کہہ رہی ہے۔ اسلام اسی وحی الہی کا اصطلاحی نام ہے، اور توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد اس کے بنیادی پتھر ہیں، جن پر خدا کی بندگی کا ایک پورا نظام فکر و عمل تشکیل پائے ہوئے

ہے۔ یہ عقائد اور یہ نظام بندگی انسان کے پورے وجود کو حق کے سانچے میں ڈھال دینے اور خیر کا پیکر بنا دینے کا تنہا ذریعہ ہیں، کامل اور کافی و دشانی ذریعہ۔

## جاہلیت کی یلغار

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وحی اور اس رہنمائی کے عطا کئے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جاہلیت اس کے آگے دم بخود ہو کر رہ گئی ہوگی، اور اب انسان، اس کے حملوں کے اندیشے سے آزاد ہو گیا ہوگا۔ وہ اتنی بودی اور کم مہمت نہیں ہے کہ وحی و ہدایت الہی کا نام سن کر از خود ڈگس ڈال دیتی۔ اس کے میگزین میں اسلحوں کی کوئی کمی نہیں۔ اس لئے وہ جس طرح انسان کی عقل کو گھیرے میں لے لیتی ہے اسی طرح اس کی مدد اور رہنمائی کے لئے اوپر سے آنے والی اس وحی الہی پر بھی ہلے بولے دیا کرتی ہے۔ اور اس کے اس ہلے کا خاص نشانہ اس وحی الہی کی بنیادی تعلیمات توحید۔ رسالت اور آخرت۔ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ ہدایت الہی کی اس آہنی فیصل کو توڑ دینے کے بعد ہی اس کی فاتحانہ پیش قدمی کے لئے راہ ہوار ہو سکے گی۔

جن لوگوں پر یہ حملے کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی عقلیں حق و صداقت کے بارے میں ماؤف ہونے لگتی ہیں اور ان کے منہ ہدایت الہی کی طرف سے مرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ادھر سے منہ مڑے نہیں کہ نفسانیت اور جاہلیت پوری تیزی سے ان پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ پھر وہ جس قدر اس کی گرفت میں آتے جاتے ہیں اسی قدر وہ فطرتاً سلیم کی روشنی سے محروم و بنی حقائق کے ادراک سے عاجز اور حق شناسی کی صلاحیت سے بے بہرہ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے جب ان کے دلوں کا زنگ آلود آئینہ سچائی کا کوئی عکس قبول کرنے کے لائق نہیں رہ جاتا اور ان کا ذہن مادیت کے حصار کا قیدی بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے اگر انسانی زندگی کا کوئی ماورائی مقصد رکھا جائے، خالص اور مکمل خدا پرستی کی دعوت پیش کی جائے، رسالت کی ضرورت اور آخرت کی اہمیت بیان کی جائے حقیقی علم کی نشان دہی کی جائے اور اس طرح انھیں سچی فلاح کی راہ دکھائی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ ان باتوں

کے ماننے پر تیار نہ ہو سکیں گے بلکہ انھیں بالکل ہی ناقابل فہم سمجھیں گے، ان پر حیرت کا اظہار کریں گے، دیوانگی کی بڑھ چڑھ کر قرار دیں گے، اور پھر باتو ادعا نے دانش مندی کی ایک خاص شاخ کے ساتھ زیر لب مسکرا کر رہ جائیں گے یا ہاتھوں میں پتھر اٹھالیں گے۔ ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ وہ کیا سن رہے ہیں؟ اپنی عقل و فہم کو ان اعلیٰ حقائق سے اس قدر بے گناہ اور اتنا ناموس پائیں گے کہ سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھریں گے، اور فرمائیں گے کہ ان بے ہنگم، باتوں کا پیش کرنے والا یا دیوانہ ہے یا سحر زدہ ہے، شاعری کر رہا ہے یا جھوٹا اور منقری ہے، اور ڈھونگ رچا کر اپنی کوئی خاص غرض پوری کرنا چاہتا ہے۔

## تاریخ کی شہادتیں

مذہب کی، اور انبیائی دعوتوں کی، تاریخ اٹھا کر دیکھے، مورق ورق پر یہی داستان لکھی ہوئی ملے گی بالکل ایک سے لفظوں میں ملے گی۔ کیونکہ جاہلیت کا مزاج ہمیشہ کیساں رہا ہے اور اسلام کی فطرت بھی کبھی بدلنے والی نہیں۔ اس لئے ان دونوں میں جب بھی ٹکراؤ ہوا اس ٹکراؤ کی کیفیت اور نوعیت بھی سدا ایک ہی سی رہی اور اس کا انجام بھی ایک جیسا رہا:-

## (۱) قوم نوح

تاریخ کا معلوم درد حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ آپ صرف آدم ثانی، ہی نہیں ہیں، بلکہ ان انبیاء کے سلسلے کی پہلی کڑی ہیں جن کی نبوتوں اور دعوتوں کا تاریخی ریکارڈ اس وقت محفوظ پایا جا رہا ہے۔ آپ کی دعوت کے تاریخی ریکارڈ کی ضروری تفصیل یہ ہے:-

حضرت نوح نے جب اپنی دعوت کا اعلان کر کے دعوت حق کا پہلا اور بنیادی نکتہ لوگوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ تمام جھوٹے اور خود ساختہ معبودوں کو چھوڑ کر صرف خدا واحد کی بندگی کرو تو ان کے بڑوں اور سربراہوں (ملا و قوم) نے اسے سختی کے ساتھ رد کرتے ہوئے لپے عوام کو تلقین کی کہ:-

لَا تَدْرُسْنَ إِلَهِتَكُمْ وَلَا  
 قَدْرَمَانَ وَحَاوِلَا سَوَاعَا  
 اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور کبھی  
 نہ ترک کرنا (حضرت) دُود اور سواع کو  
 اور نہ (حضرت) یغوث کو، یوق کو  
 دنوہ - ۲۳ اور نسر کو۔

اور حضرت نوح کو انہوں نے یہ جواب دیا کہ:-

إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ  
 ہم تمہیں کھلی ہوئی گم راہی میں مبتلا دیکھ  
 (اعراف - ۶) رہے ہیں۔

یعنی ان دانش مندوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو لاشریک ماننا کوئی معمولی ضلال نہ تھا، بلکہ ضلالِ مبین تھا، ایسا ضلال تھا جس کے ضلال ہونے میں دورا میں ہو ہی نہیں سکتی تھیں، اور یہ بات دود و حار کی طرح واضح اور دیدہ بے تھی کہ اگرچہ اس عظیم کائنات کو پیدا کیلئے اللہ تعالیٰ کیا ہے لیکن اسے چلا رہے ہیں بہت سے خدا، اور بہت سے خدا ہی اسے چلا سکتے ہیں، اور یہ صریح نادانی اور گمراہی کی بات ہے کہ خدائی کے سارے اختیارات اور حقوق صرف ایک ہی خدا کے لئے مختص سمجھ لئے جائیں۔ حضرت نوح نے انہیں جواب دیا کہ امر واقعی وہ ہرگز نہیں ہے جو تم سمجھ اور کہہ رہے ہو، بلکہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔ ضلالِ مبین میں میں مبتلا نہیں ہوں، بلکہ تم خود مبتلا ہو، اور اس لئے ہو کہ تمہاری عقل ماری گئی ہے اور تمہارے دل و دماغ پر جہل اور جاہلیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ (وَالَّذِينَ آذَاكُمْ قَوْمًا تَهْتَبُونَ ہود - ۲۹) اور پھر جاہلیت کا یہ پردہ اس وقت تک نہ ہٹ سکا جب تک کہ اس کا اخلاقی نتیجہ ظہور میں نہ آگیا اور خدائے قہار کا عذاب ان پر برس نہ پڑا۔ اور بعضوں کی آنکھ پر تو یہ پردہ اس وقت بھی پڑا ہی رہ گیا، وہ اب بھی خدائے قادرِ مطلق کو کوہِ جودی سے فرد تر گمان کرتے رہے۔

اسی طرح جب آپ نے اپنی رسالت پر ایمان لانے کا ان سے مطالبہ کیا تو اس کے جواب میں بھی اسی انکار، حیرت اور استعجاب کا اظہار کیا گیا جو دعوتِ توحید کے سلسلے

میں کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا، بالفرض مجھ کو پہنچا ہے تو اس نے چاہا بھی ہو کہ ہم انسانوں کے پاس اپنا کوئی پیام بر بھیجے، تب بھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہی جیسے ایک آدمی کو اس غیر معمولی منصب کے لئے اس نے منتخب کیا ہو؟ تم تو ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو، پھر کس منہ سے یہ دعویٰ کرتے ہو کہ میں خدا کا فرستادہ ہوں؟ اگر اللہ کو اپنا کوئی فرستادہ مقرر کرنا ہی ہوتا تو اس نے اپنے کسی مقرب فرشتہ کو مقرر کیا ہوتا (مَا هَذَا إِلَّا نُبْشٌ مِّثْلُكُمْ..... وَكُوشَاءَ اللَّهِ لَا نُزْلَ مِثْلُكُمْ - المؤمنون ۲۳) اور یہ کہہ کر انہوں نے نہ صرف یہ کہ آپ کے نبی ہونے کو ناقابل فہم اور ناقابل قبول ٹھہرا دیا بلکہ پورے سلسلہ رسالت کا اور نفس رسالت ہی کا انکار کر دیا۔ کیونکہ ایک حضرت نوح ہی نہیں، سارے انبیاء بشر ہی ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر بشریت کی دلیل کی بنا پر آپ کو نبی نہیں مانا جا سکتا تو یہ صرف آپ ہی کی نبوت کا انکار نہیں تھا، بلکہ سبھی نبیوں کی نبوت کا اور نفس نبوت ہی کا انکار تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی خود قرآن نے تصریح فرما رکھی ہے (كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ لِئِذَا سَلَیْنُ - شعراء - ۱۰۵)

پھر یہ انکار بھی انکار محض نہیں تھا، بلکہ تعجب بھرا انکار تھا۔ ان کے اسی تعجب کا تذکرہ

کرتے ہوئے حضرت نوح نے فرمایا تھا:-

اور کیا (تم میری نبوت کے منکر ہو اور تمہیں)

أَوْ عَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ

اس بات پر حیرت ہے کہ تمہارے رب

ذِكْرٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَلَى

کی طرف سے تمہارے اندر کے ایک آدمی

سَجَلٍ مِّنْكُمْ لِيُنذِرَكُمْ

پر حق کی یاد دلائی آئی ہے، تاکہ وہ تمہیں (آخر

وَلْتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ

سے) بخبردار کر دے اور تاکہ تم خدا کی ناراضی

تُرْهِمُونَ

سے بچ سکو اور توقع ہو کہ تم پر رحم کیا جائے؟

(اعراف - ۶۳)

حضرت نوح کے اس ارشاد میں دعوتِ حق کے سارے ہی بنیادی عناصر موجود تھے، اور

قوم کا اظہارِ تعجب ان سبھی باتوں پر تھا۔ آپ کے کہنے کا مطلب یہ تھا جب اللہ تعالیٰ ہی تمہارا

رب ہے تو اس کی ربوبیت صحیح معنوں میں ربوبیت ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر وہ تمہاری اخلاقی اور روحانی ربوبیت اور پرورش کا بھی کوئی سامان نہ کرتا، جب کہ اس نے تمہاری جسمانی پرورش اور مادی ضرورتوں کی فراہمی کا اتنا وسیع، مکمل اور حکیمانہ نظام قائم کر رکھا ہے جس کا تم اپنی کھلی آنکھوں میں مشاہدہ کر رہے ہو۔ تمہاری اخلاقی اور روحانی تربیت کا یہی ناگزیر نظام تو ہے جو اللہ کے ذکر، یعنی اس کی وحی اور ہدایت کی شکل میں تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ذکر کو تم تک پہنچانے کے لئے اگر ایک انسان کو، اور خود تمہارے اپنے ہی اندر کے ایک فرد کو، منتخب کیا گیا ہے تو ایسا ہونا ہی چاہئے تھا۔ کیونکہ اس ذکر کی غرض و غایت اسی وقت پوری ہو سکتی تھی جب حسب ضرورت اس کی تشریح اور تفہیم بھی ہوتی رہتی اور اس کی پیروی کا عملی نمونہ بھی تمہارے سامنے آتا رہتا، ورنہ اس کی مطلوبہ پیروی کا طریقہ اجمال کے دھندلکے میں بڑی حد تک چھپ کر رہ جاتا، اور اللہ کی جیسی ہوتی تعلیمات کے سارے گوشے اور قضاے تم پر واضح نہ ہو سکتے اور جب ان تعلیمات کے سارے گوشے اور قضاے واضح نہ ہو سکتے تو ان کی پیروی کا حق بھی ادا نہ ہو سکتا۔ یہ عظیم مصلحت اسی وقت پوری ہو سکتی تھی جب تمہارے ہی جیسے جذبات و احساسات اور تمہاری ہی جیسی فطری ضرورتیں رکھنے والی کسی مخلوق کو اس منصب رسالت پر مامور کیا جاتا۔ اور یہ مخلوق بدلتہ انسانی مخلوق ہی ہو سکتی ہے۔ کوئی فرشتہ یا کوئی اور مخلوق نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ فرشتہ یا کوئی اور مخلوق نہ بشری ضرورتیں رکھتی ہے نہ انسانی جذبات و احساسات کا ادراک کر سکتی ہے، اور جب وہ ان ضرورتوں اور جذبات و احساسات کا ادراک نہیں کر سکتی تو وہ تمہارے مسائل کو سمجھ بھی نہیں سکتی، اور جب وہ نہ تمہاری فطری ضرورتوں اور مانگوں کو محسوس کر سکتی نہ ان ضرورتوں اور مانگوں کی بنیاد پر پیدا ہونے والے مسائل کو سمجھ سکتی تو ان کے سلسلے میں تمہاری مبنی بر ضرورت اور مبنی بر حق رہنمائی بھی نہیں کر سکتی تھی اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ تم کو ایک بشر کے رسول خدا ہونے پر تعجب ہو۔ تعجب کی بات تو یہ ہوتی کہ تم انسانوں کی رہنمائی کے لئے کسی انسان کو نہیں، بلکہ کسی فرشتے کو یا کسی اور مخلوق کو رسول بنا کر





## ۲۲، قوم ہود (عاد)

قوم نوح کے بعد قوم عاد تاریخ عالم کی ایک مشہور اور زبردست قوم کی حیثیت سے ابھر کر نمایاں ہوئی اور حضرت نوح کے بعد حضرت ہود علیہ السلام اللہ کے رسول کی حیثیت سے تشریف لائے۔ دونوں طرف پھر وہی صورت حال تھی۔ قوم سر تاپا جاہلیت میں غرق تھی۔ اس لئے آپ کی دعوت کا بلند ہونا تھا کہ ایک سخت کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ ادھر سے دین حق کی جو بات بھی پیش کی گئی ادھر سے اس کا جواب انکار، استعجاب، استہزار اور اظہارِ غنیمت کی شکل میں دیا گیا۔ ہدایت الہی کے ہر نکتے کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تو بڑی عجیب و غریب بات ہے، ایسے خیالات تو آج تک کبھی سننے ہی میں نہیں آئے تھے ان کا ماننا نہ ماننا تو بوجہ کا مسئلہ ہے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ باتیں کسی طرح قابلِ فہم ہیں بھی؟ آخر یہ کوئی سمجھ میں آنے والا دعویٰ ہے کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود ہے ہی نہیں، نہ ہو سکتا ہے؟ اور اس خدا سے ہم حقیر انسانوں کا راست تعلق ہے، اور اس کی جناب میں اپنی گذارشیں پہنچانے کے لئے کسی شفیع کی ضرورت بھی نہیں۔ پھر تمہارا یہ کہنا بھی کتنا عجیب ہے کہ تمام لوگوں کو مر کر مٹی ہو جانے کے بعد ایک روز از سر نوزندہ کیا جائے گا۔ بھلا یہ دعویٰ کبھی مان لئے جانے کے قابل ہو سکتا ہے کہ جو بات ہزاروں برس گذر جانے کے باوجود آج تک کبھی ظہور میں آئے دکھی نہیں جاسکتی وہ یقیناً ظہور میں آکر رہے گی۔ ایسی لایعنی بکو اس پر یہ سلامتی ہوش و حواس کوئی کیسے کان دھر سکتا ہے؟ ہمارے ایسے بزرگ تو ان نام نہاد حقائق سے بے خبر گذرتے چلے گئے، مگر آج تم جیسے ایک معمولی شخص پر سب کچھ منکشف ہو گیا ہے ابو شخص خود بھی ہمارے ہی جیسا ایک بشر ہو اور جو عام لوگوں کی طرح کھا تا پیتا، سوتا جاگتا، بیمار پڑتا اور کلیفیں بھگیتا اور اپنی ضروریات کے لئے بازاروں میں چلتا پھرتا ہو وہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس رب السموات والارض کے پاس سے پیام آیا ہے اور میں اس کا سفیر اور رابطہ ہوں، تو اس کے اس مہمل دعوے کو صبر کے ساتھ کون سن سکتا ہے؟ غرض علم حق کی

ایک ایک بات ان جاہلیت مآبوں کے لئے ناقابل فہم اور موجب حیرت ثابت ہوئی۔  
توحید کا پیغام سنا تو جھپٹتے ہوئے بولے :-

أَجْتَأُ لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَهُدًى  
وَقَدْ سَرَّمَا كَانَ  
يَعْبُدُ آبَاءَنَا

کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم  
ایکے ایک خدا کی بندگی کریں اور ان سب  
معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے  
اسلاف پرستش کرتے رہے ہیں؟

(اعراف - ۷۰)

أَجْتَأُنَا لِنَأْتِيَكَ  
عَنِ الْهَيْئَةِ  
بِرِغْصَةٍ كَرْدٍ

کیا تم ہمارے پاس اس غرض سے آئے  
ہو کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے  
برگشتہ کر دو؟

(احقاف - ۲۲)

اور آخری بات یہ کہ :-

مَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ  
قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ  
بِمُؤْمِنِينَ (اعراف)

ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو  
بہرگز نہیں چھوڑنے کے، اور تمہاری باتیں  
کبھی مان نہیں سکتے ہیں۔

(اعراف)

ایسا ہی رد عمل آپ کی نبوت اور آخرت کے بارے میں ظاہر کیا گیا، جیسا کہ ان کے اس  
رد عمل پر حضرت بوڈ کے اس متعجبانہ اظہار خیال سے صاف واضح ہوتا ہے۔

.... أَوْ عَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ  
ذِكْرٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَلَى  
رَجُلٍ مِنْكُمْ  
لِيُنذِرَكُمْ ..... الخ

.... کیا تم میری بات نہ مانو گے اور  
تمہیں اس بات پر حیرت ہے کہ تمہی  
میں سے ایک شخص کے پاس تمہارے  
رب کی طرف سے 'ذکر' آیا ہے تاکہ تمہیں  
(آخرت کی بازیگری سے) خبردار کر دے؟

(اعراف - ۶۹)

اور نہ صرف یہ کہ ان کا رد عمل انکار اور تعجب کا رہا بلکہ آگے چل کر اس نے چیلنج  
کی شکل بھی اختیار کر لی۔ انہوں نے جیسے تنگ آ کر کہا :-

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ  
كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ  
اچھا تو (اب) لے ہی آؤ وہ عذاب  
جس کی ہمیں دھمکی دے رہے ہو اگر تم  
سچے ہو۔ (احقاف - ۲۲)

غرض ان کے لئے دین حق کی بنیادی تعلیمات میں سے ہر چیز ایک العجوبہ اور عقل و  
فہم سے یکسر بعید تھی، اور ان کا اصرار تھا کہ یہ شخص پر لے درجے کا جھوٹا اور عقل و خرد سے  
گیا گذر رہا ہے۔

إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا  
لَنُظَنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ  
یقیناً ہم تمہیں حماقت میں مبتلا پارہے  
ہیں اور ذرا شبہ نہیں کہ تم بکے جھوٹے ہو۔  
(اعراف - ۶۶)

جواب میں آنجناب نے انہیں پھر سمجھانے کی کوشش کی اور فرمایا: اے میرے لوگو! میں ہرگز مبتلائے حماقت نہیں ہوں۔ ذرا اٹھ کر سنجیدگی کے ساتھ سوچو تو سہی کہ میری کون سی بات حماقت کی ہے؟ میں تو اللہ کا بھیجا ہوا رسول اور بادی ہوں۔ کیا تم اتنی واضح بات سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو کہ تم لوگوں کو حق و صداقت کی اور فلاح و سعادت کی راہ دکھانا تمہارے پروردگار کی پروردگاری کا لازمی تقاضہ تھا۔ رہی یہ بات کہ اس غرض کے لئے اس نے مجھے اپنا ایلیٰ بنا لیا ہے، اور میں اس دعوے میں سچا ہوں، تو میری پیش کی ہوئی تعلیمات کی محققیت پر غور کرو، میرا اب تک کا کردار اور اخلاق دیکھو، میری پیروی کے پاکیزہ نتائج پر نظر ڈالو، کیا یہ سب کچھ میرے برحق اور صادق ہونے کی شہادت نہیں ہے؟ مگر عقل کے اندھوں نے ان کی ایک نہ سن کر دی اور ان کی تعلیمات کو بدستور ناقابل فہم قرار دیتے رہے، اور حضرت ہود کی زبان سے ان باتوں کے نکلنے کی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آئی یہ آسکی کہ ہمارے کسی معبود نے اس شخص کی گتباخوں پر ناراض ہو کر اس کی عقل اردی ہے۔  
رَبِّنْ نَقُولُ إِلَّا اشْرَاكَ بَعْضُ الْبَهِتَاءِ بِسُوءٍ - ہود - ۵۴ اور پھر ان  
ان مدہوشوں کو ہوش اسی وقت آسکا جب سات راتوں اور آٹھ دنوں تک چلنے

والی باہر صر نے انھیں تہس نہس کر کے رکھ دیا (سورہ حاقہ ۶-۷)

### (۳) قوم صالح (ثمود)

قومِ علا کے بعد اس کے بقایا 'ثمود' اس کے جانشین ہوئے، اور حضرت ہود کی لائی ہوئی ہدایتِ الہی کے امین بنے۔ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ یہ امانت خیانت کی نذر ہونے لگی اور رفتہ رفتہ یہ قوم بھی جاہلیت کی آغوش میں جا پڑی۔ حضرت صالح علیہ السلام اس کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے، اور ایک بار بھرتی و باطل کا معرکہ گرم ہو گیا۔ نبوت سے پہلے حضرت صالح قوم کے چشمِ د چراغ سمجھے جا رہے تھے اور ان سے وہ بڑی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھی۔ مگر اپنی نبوت کا اعلان اور توحید کی پکار بلند کرتے ہی وہ اس کے لئے بڑی قابلِ نفرت شخصیت قرار پا گئے، اور لوگوں نے پشانی پر بل ڈالتے ہوئے ان سے کہا:-

يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا  
مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا أَتَنهَانَا  
أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ  
آبَاؤُنَا ..... الخ

صالح! اب تک ہمیں تم سے بڑی  
امیدیں رہی ہیں (لیکن اب یہ کیا ہو رہا  
ہے کہ تم ہمیں ان معبودوں کی پرستش  
سے روک رہے ہو جن کو ہمارے

(ہود - ۶۲) اسلاف پوجتے رہے ہیں؟

دعوتِ توحید ہی کی طرح آپ کے دعوئے نبوت کو بھی ٹھکرا دیا گیا، اور اس کی نسبت سے آپ پر تبصرہ یہ کیا گیا:-

إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسْتَكْرَبِينَ  
مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا

تم تو نرے سحر زدہ ہو، تم اس کے سوا  
اور کچھ نہیں کہ ہمارے ہی جیسے ایک

دشوار (۱۵۳-۱۵۴) بشر ہو۔

قوم کے اس تبصرے میں وہی ساری بوالعجیباں موجود تھیں جو حضرت نوح اور

حضرت ہود علیہا السلام کی قوموں کے جوابات میں پائی جاتی رہی ہیں، اور جن کی ضروری تفصیل آپ ابھی پڑھ چکے ہیں۔

## ۴۴) قوم لوط

حضرت صالحؑ کے بعد جن اور انبیاء کی بعثت ہوتی رہی، کم و بیش اسی طرح کے جوابوں اور تبصروں سے انھیں بھی 'نوازا' جاتا رہا، یہاں تک حضرت لوط علیہ السلام کی باری آئی آپ کو بعض نئی باتوں سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ آپ کی قوم اعتقادی جاہلیت کے ساتھ ساتھ ایک گھناؤنی قسم کی اخلاقی نوعیت کی جاہلیت میں بھی لت پت تھی۔ اس لئے آپ نے اسے توحید، رسالت اور آخرت کی دعوت کے ساتھ ہی ساتھ اخلاقی پاکیزگی کی بھی زبردست تلقین کی۔ مگر چند ایک کو چھوڑ کر کسی نے بھی کوئی بات نہ سنی۔ سنا تو درکنار ان کلموں نے ان کی 'ناک' کا الٹا مذاق اڑایا۔ گویا کچھلے انبیاء کی قومیں جہاں صرف بے عقلی اور بے عقلی کا شکار رہی تھیں وہاں یہ ناسنجار قوم بے عقلی اور بے عقلی کے علاوہ عقلی سڑاندگی کی انت میں بھی گرفتار تھی۔ اس لئے توحید، آخرت اور رسالت کے بارے میں انھوں نے جو کچھ گل افشائیاں، کیس وہ تو لیں ہی، دنیا کی مسلمہ اخلاقی غلامت کے خلاف بھی کوئی نصیحت اور تلقین گوارا نہ کی، اور پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ انہیں لوط اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں پر طنز کرتے ہوئے بولے "یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں"۔ (الانہم اَنَاسٌ یَّتَطَهَّرُونَ۔ اعراف۔ ۸۲) جاہلیت کے ان بے باک پیروں کے پیٹے کی آنکھیں جب اس حد تک پھوٹ چکی تھیں تو انھیں حق و صداقت کے اعلیٰ حقائق کس طرح اپیل کر سکتے تھے۔ اس لئے حضرت لوط کی کوئی ایک بات بھی ان کی سمجھ میں نہ آسکی، اور بالآخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ بہت ہو چکا اب اس عجیب و غریب مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے، اور ان 'بکواسیوں' کو دیس نکال دے دینا چاہیے (اٰخِرُ بُوْحُم مِّنْ قَرْنِیْکُمْ۔ ایضاً)

## (۵) قومِ شعیب

کچھ مدت کے بعد جب اہل مدین اور صحابہ الایکہ نے جاہلیت کی باگ ڈور سنبھالی تو رحمت الہی نے ان کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو مامور کیا یہ لوگ بھی اپنے پیش روؤں سے کچھ مختلف نہ نکلے اور انھیں بھی جب حق کا تریاق پلانے کی کوشش کی گئی تو اس کی تمنی اور سمیت کی شکایت ہو گئی۔ قوم لوط کی طرح یہ بھی اعتقادی گم راہیوں کے ساتھ ساتھ ایک اور خاص اخلاقی عیب، تجارتی بد عنوانیوں کے عیب، میں بڑی شہرت حاصل کئے ہوئے تھے۔ اس لئے حضرت شعیب نے انھیں توحید اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دینے کے ساتھ ہی اس عیب کی طرف بھی ان کی توجہ دلائی۔ اس کی وجہ سے دعوتِ حق کو ایک نیا تجربہ اور جاہلیت کا ایک خاص اندازِ فکر و استدلالِ روشنی میں آیا۔

دعوتِ توحید کے جواب میں انھوں نے کہا:-

يَا شُعَيْبُ اَصْلُوْنَاكَ  
تَا مُرُوكَ اَنْ نَشْرُكَ  
مَا يَعْْبُدُ اَبَاؤُنَا  
اے شعیب! کیا تمہاری یہ ناز تمہیں  
یہ حکم دے رہی ہے کہ ہم ان معبودوں  
کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے اسلاف

(ہود-۸۷) پوجتے رہے ہیں؟

’جنہیں ہمارے اسلاف پوجتے رہے ہیں‘ کہنے سے ان کا مدعا بس ایک تاریخی حقیقت کا یاد دلانا نہیں تھا، بلکہ اس جملے کے اندر دراصل ان کا اپنے مسلک کے حق میں ایک بہت بڑا ’استدلال‘ پوشیدہ تھا۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ایسے عالی مقام بزرگوں کے مقابلے میں تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ اس لئے ہم اس بات کو کیسے معقول مان لیں کہ وہ تو براہِ راست سے نا آشنا تھے اور تم پر امرِ حق روشن ہے؟ ان بزرگوں کا فلاں ہستیوں کو معبود ماننا غلط تھا؟ اور تمہاری بات صحیح ہے؟

آپ کی نبوت کی بات سن کر بولے 'باولے ہو گے، ہوتے ہو جادو کر کے تمہاری عقل  
 ماری گئی ہے، جھوٹ بکتے ہو کہ اللہ رب العالمین کے فرستادے ہو۔ ہمارے ہی جیسے ایک  
 معمولی بشر ہوتے ہوئے مالک الملک کے فرستادے کیسے ہو سکتے ہو؟ (إِنَّمَا أَنْتَ  
 مِنَ الْمُسْحَرِينَ وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِن نُّظُنُّكَ لَكِن الْكَاذِبِينَ) شوار  
 (۱۸۵-۱۸۶)

جب آپ نے ان کی کاروباری بے ایمانیوں پر ان کو ٹوکا اور سمجھایا کہ اپنے تمدنی اور  
 معاشی نظام کو بد عنوانیوں سے پاک کرو، ٹاپ تول میں پھل فریب سے کام لینا چھوڑ دو، جو کہ  
 تمہارے ہاں ایک متفقہ معروف، بنا ہوا ہے، تو بھڑک اٹھے، اور کہنے لگے یہ روٹی روٹی  
 کے معاملے میں اخلاق کو کہاں گھسائے دے رہے ہو؟ کیا ہم تمہارے اس اجتماع فلسفے  
 پر اپنے معاشی مفادات کو قربان کر دیں؟ ترازو کی ڈنڈی مارنے کی کارگر تدبیر سے جو فائدے  
 ہمیں حاصل ہوتے ہیں، محض اس لئے چھوڑ دیں کہ آخرت میں اس سے نقصان ہوگا، اس  
 آخرت پر جو بجائے خود کوئی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض وہ کبھی آنے والی  
 ہو بھی تو اس کی خاطر اپنی دنیا کو برباد کر دینا اور نقد کو نسیہ پر نثار کر دینا کون سی عقل مندی  
 ہے؟ بڑے حلیم اور رشید بننے چلے ہو، تمہاری نماز اگر توحید اور آخرت کا اور اخلاق و  
 صفائی معاملات کا حکم دیتی ہے تو تم بطور خود اس پر عمل کرتے رہو، ہمیں کیوں مجبور کرتے ہو  
 کہ اپنا مجرب طریقہ چھوڑ دیں؟ مذہب کا معاملہ ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے، دوسروں پر اپنے  
 مزعومات کو مسلط کرنے کا ہمیں کیا حق ہے؟ (قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَوْتُكَ تَأْمُرُكَ  
 أَنْ تَنْسُرَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِن لَّنَفَعَلٌ فِي أَمْوَالِنَا مَا لَنَشَاءُ وَإِنَّكَ  
 لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ۔ ہود - ۸) پیغمبر نے ان کی اس کج فکری اور اس جاہلانہ  
 تصور مذہب کو پھر درست کرنے کی کوشش کی، ان کے سونے ہوئے ضمیر کو جگا کر اللہ  
 تعالیٰ سے استغفار کرنے کی نصیحت کی، انجام سے ڈرایا، جزا و سزا کے بارے میں خدا  
 کی دائمی سنت یاد دلانا چاہی، مگر آپ کی کوئی نصیحت، کوئی تلقین اور کوئی تہدید ان کے دل

دماغ کے بند دروازوں کو کھول نہ سکی، وہ انکار پر انکار کرتے رہے، اور آخر میں صاف صاف کہہ دیا کہ:-

يَا شُعَيْبُ مَا نَفَقْتُمْ كَثِيرًا  
مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ  
فِينَا ضَعِيفًا وَلَوْلَا دَهْطُكَ  
لَسَرَجْنَاكَ - (سہود - ۹۱)

شعیب! تمہاری اکثر باتیں تو ہماری  
سمجھ ہی میں نہیں آتیں، اور اپنے درمیان  
ہم تمہیں کم زور پارہے ہیں، اگر تمہارا قبیلہ  
نہ ہوتا تو ہم تمہیں ضرور ہی سنگسار کرتے۔

جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ ”تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں“ چلے جس ادعا نے دانش مندی کے نشہ میں، اور کتنے ہی گہرے طنز کے ساتھ کہی گئی ہوں، مگر اس میں ذرا شبہ نہیں کہ امر واقعی کے عین مطابق تھی۔ جاہلیت کے عشق نے ان کی عقل کو اس حد تک اپنا معمول، نہالیا اور ان کی انسانی فطرت کو اس قدر مسخ کر ڈالا تھا کہ عقل سلیم کو اپیل کرنے والے علم حق کے روشن ترین حقائق کو سمجھ سکنے کی کوئی صلاحیت ان میں باقی ہی نہیں رہ گئی تھی جس طرح ایک پیدائشی اندھا نہرا سمجھانے کے باوجود یہ نہیں سمجھ سکتا کہ سفیدی کیا چیز ہوتی ہے اور سرخی کسے کہتے ہیں، ٹھیک اسی طرح شرک اور کفر و فسق و فجور میں مدت دراز سے ڈوبے ہوئے شخص کے ذہن میں بھی نہ یہ حقیقت اتر پاتی کہ ذات واحد کے سوا اور کوئی بھی ہستی لائق پرستش نہیں، اور نہ یہ کہ اللہ رب العالمین کی طرف سے انسانوں کو حق کی تعلیم دینے کے لئے خود انہی میں سے کچھ افراد پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث ہوا کرتے ہیں، اور نہ یہ کہ سبھی لوگ مرنے کے بعد ایک روز دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جانے والے ہیں تاکہ ان کی زندگی بھر کے اعمال کا حساب لیا جائے اس لئے اس قوم نے حضرت شعیب سے اگر لانا نفقہ کثیراً مِمَّا تَقُولُ کہا تھا تو از روئے واقعہ کچھ غلط نہیں کہا تھا۔

آپ نے اوپر کے صفحات میں قدیم زمانوں کی کچھ مشہور قوموں کے بارے میں قرآن کریم کا یہ جو بیان واقعہ پڑھا ہے اور ابھی آگے چل کر بھی پڑھیں گے، کہ ان کے لئے توحید اور



آخرت اور رسالت ہر ایک کی بات ایک چنبھ کی بات ثابت ہوتی رہی، تو ان کا یہ اظہار  
تجب بھی دراصل اسی ”لَا تَنْفَعُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ“ کا منظر ہوتا تھا۔

## (۶) قوم فرعون

شب و روز کی گردش حسب معمول جاری رہی۔ یہاں تک کہ سرزمین مصر میں قبطی  
قوم کو عروج ملا اور فرعون بنی خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔ یہ لوگ پوری طرح جاہلیت میں  
ڈوبے ہوئے تھے۔ جب مصر میں چند صدیوں قبل جا کر آباد ہو جانے والے بنی اسرائیل کی  
اصلاح و ہدایت اور رہنمائی کے لئے، نیز فرعون کے مظالم سے انھیں نجات دلانے کے لئے  
حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو قبطی قوم کو حق کی دعوت دینے کی ذمہ داری بھی  
ان کے سپرد تھی۔ انبیائی طریق دعوت کے مطابق حضرت موسیٰ نے قوم کے سربراہ کی حیثیت  
سے فرعون اور اس کے درباری امراء کو اپنا پہلا مخاطب بنایا۔ فرعون کے دربار میں جا کر  
اس کے سامنے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور توحید کی دعوت پیش کی۔ اس دعوت کا پیش ہونا  
تھا کہ واقعات کے پردے پر پھر وہی مناظر نمودار ہونے لگے، اور برابر ہوتے رہے، جو حضرت  
نوح کے زمانے سے لے کر اب تک نمودار ہوتے چلے آ رہے تھے۔ حضرت موسیٰ کو نبوت کے  
مقام پر فائز کر کے حکم ہوا:-

اِنَّ اُمَّتَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ  
قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ  
کہ ظالم قوم کے پاس جا۔ فرعون کی قوم  
کے پاس۔ کیا یہ لوگ (اپنے انجام  
دشوار ۱۰-۱۱) کی طرف سے) بالکل بے خوف ہیں۔

جس قوم کا اللہ جل مجدہ نے گویا نام ہی القوم الظالمین (ظالم قوم) رکھ  
دیا ہوا نہ اندازہ کیجئے کہ وہ حق سے کتنی دور اور باطل و جاہلیت کی کیسی دلدادہ رہی ہوگی، اس  
لئے اس دعوت کا جو جواب اس ظالم قوم نے دیا وہ توقع کے ٹھیک مطابق یہ تھا کہ:-

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْ  
ہم نے تو ایسی باتیں اپنے پہلے کے

آبَاءَنَا الْأَوْلِيَيْنَ (قصص-۳۶) بزرگوں سے کبھی نہیں نہیں۔

اس چند لفظی جملہ میں انکار بھی تھا، استعجاب بھی تھا، اور اس کی دلیل بھی تھی۔ دلیل یہ تھی کہ جب ایسے ایسے بزرگ نہ خدا کو ایک اور لاشریک ماننے اور کہتے تھے نہ قیامت اور آخرت کا تصور رکھتے تھے اور نہ کسی عام انسان کے بارے میں یہ سوچ بھی سکتے تھے کہ وہ خالق و مالک کائنات کا فرستادہ مقرر ہو سکتا ہے تو آج ایک معمولی شخص کی زبان سے نکلی ہوئی یہ نئی اور انوکھی باتیں کیسے مان لی جاسکتی ہیں؟ اور ان کے معقول و قابلِ نور ہونے کا مطالبہ ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟

خیر قوم تو اسی حد پر رک گئی کہ وہ صرف ظالم تھی، مگر فرعون صرف ظالم ہی نہیں ظالموں کا سردار، اور سردار ہی نہیں بزمِ غلوش ان کا الہ، اور ربِ اعلیٰ تھا، اس لئے وہ ظلم اور سرکشی کے انتہائی اور غیر معمولی مظاہرے کے بغیر کیسے رک سکتا تھا۔ سو اس نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور لاشریک معبودیت کے انکار سے آگے بڑھ کر اپنی ملکیتِ عصر کی حد تک اس کی ربوبیت، آقائی اور حاکمیت کا بھی سرے سے انکار کر دیا، اور اسے ناقابلِ قبول ہی نہیں ناقابلِ فہم قرار دے دیا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے جب حکمِ الہی کی تعمیل کرتے ہوئے اس کے بھرے دربار میں جا کر اعلان کیا کہ:-

إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ      بالیقین ہم رب العالمین کے

(شعراء-۱۶)      فرستادے ہیں۔

تو وہ فوراً بول اٹھا:-

وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ (شعراء-۲۳) اور یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟

اس کے اس سوال میں استعجاب تو ضرور تھا مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ دہرہ اور منکر خدا تھا جب وہ خود اپنی الوہیت کا مدعی اور ربِ اعلیٰ ہونے کا دعوے دار تھا تو دہرہ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ چنانچہ قرآن مجید کے اندر اس کے جن دوسرے اقوال کو مختلف مقامات پر نقل کیا گیا ہے ان میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ وہ خالق و مالک کائنات

ہی کا نہیں فرشتوں کا بھی قائل تھا (ملاحظہ ہو سورہ زخرف آیت ۵۳) اس کے کہنے کا مطلب صرف یہ تھا ملکِ مصر کی حد تک میں ہی سب کچھ ہوں، اس ملک کا فرماں روا ہے مطلق بھی ہوں اور اس کے باشندوں کا معبود اور ربِ اعلیٰ بھی ہوں۔ اور یہ اس کا قہر اور جبر کا سحر تھا کہ پوری قبیلہ قوم اس کے اس دعوے کے آگے سپردِ لے ہوئے تھی، جسے قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے کہ ”اس نے اپنی قوم کو بے وزن بنا رکھا تھا اور وہ اس کے حضور پوری طرح تسلیمِ خم کئے ہوئے تھی“ (فَاسْتَخَفَّتْ قَوْمَهُ فَاطَاعُوهُ زخرف-۵۴) پس وہ رب العالمین اور فرماں روا ہے کائنات کی ہستی کا منکر نہیں تھا، بلکہ ایسے رب العالمین اور فرماں روا ہے کائنات کا منکر تھا، بلکہ یوں کہنے کے منکر بنا ہوا تھا جس کی ربوبیت اور فرماں روائی ملکِ مصر پر بھی اسی طرح قائم اور جاری و ساری ہو جس طرح باقی کائنات پر قائم ہے۔ اپنے اسی احمقانہ دعوے کی بنا پر، قدرتی طور پر، اس کا خیال یہ تھا کہ میں کسی بیرونی ہدایت کا ہرگز محتاج نہیں ہوں۔ موسیٰ جھوٹا کہتا ہے کہ میں اللہ رب العالمین کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔ میرے پاس کسی نبی کے آنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر بالفرض باقی کائنات کے فرماں روا کو نبی فرماں روا ہے مصر کے پاس اپنا کوئی ایلی بھیجا ہی ہوتا تو کسی ایسے عالی مرتبہ شخص کو بھیجتا جو اگر خود فرشتہ نہ ہوتا تو اس کے جلو میں کچھ فرشتے ضرور ہوتے جو اس کے آگے ہٹو بچو کی منادی کرتے ہوئے چلتے، نیز امراء و شہزادگان کی طرح اس کے ہاتھوں میں سونے کے گنگن ہوتے۔ غرض بشر ہوتے ہوئے بھی وہ فوق البشر ہوتا۔ حماقت اور جاہلیت کا کمال دیکھیے کہ فرعون خود تو ایک بشر ہونے کے باوجود معبود اور ربِ اعلیٰ ہو سکتا تھا، حالانکہ اس کے جلو میں کوئی ایک بھی فرشتہ نہیں تھا، مگر حضرت موسیٰ اللہ کے رسول اور ایلی نہیں ہو سکتے تھے اس لئے کہ ان کے ارد گرد فرشتوں کا کوئی گھرمٹ نہیں دکھائی دیتا تھا! فرعون کی یہ باتیں، خصوصاً اس کا یہ دعویٰ کہ وہی اہل مصر کا الہ و رب ہے اور اس کا یہ سوال کہ رب العالمین کیا چیز ہے، جس قدر بربودا و عقلمند و فہم سے بعید تھا اسے ایک معمولی سمجھ رکھنے والا شخص بھی بدانتہا محسوس کر لے سکتا ہے چنانچہ

اس کے اس اجماعانہ سوال کے جواب میں حضرت موسیٰ نے دوہی ایک جملے کہے تھے کہ اس کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی، اور پھر اس کے بجلے کہ وہ اپنی اوقات پر نظر ڈال کر سیدھی طرح حق بات کو مان لیتا، اپنے موقف کی حمایت میں وہی لاجواب دلیل پیش کر دی جسے ہر جبار عنید معقولیت کے میدان میں شکست کھا جانے کے بعد پیش کیا کرتا ہے۔ اس نے کہا ”موسیٰ! اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو اپنا رب بنایا تو میں یقیناً تجھے قید کر دوں گا“ (لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَلْهٰمُ اَعْلَمُ بِرَبِّكَ لَا يُحِيطُ بِشَيْءٍ مِّنْ السَّمٰوٰتِ وَ اَلْاَرْضِ وَ يَظُنُّ اَنَّ اِلٰهًا مِّثْلَكَ مَلِكًا) (۲۹)

یہ پرانے زمانوں کی چند تاریخی شہادتیں ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خدا پرستی، آخرت اندیشی، نیکی، تقویٰ اور حسنِ خلق کے پاکیزہ تصورات کو جو عقل سلیم کے بدیہی مسلمات اور روح انسانی کی مرغوب غذا ہیں، آدمی بسا اوقات کتنی ناگواری اور ترش روئی کے ساتھ ٹھکرا دیا کرتا ہے۔ پھر ان شہادتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس عاقبت دشمن حرکت کی وجہ ہر دور میں، ہر جگہ اور ہر قوم کے ہاں ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ انسان کی خود فراموشی، ذہنی پستی، فکری کجی، عقلی فساد، باپ دادا کی اندھی تقلید، نفس پرستی اور جاہلی حیمیت۔ یہی وہ نامبارک حجابات ہیں جو حق کے لئے نفوذ کی راہ کو بند رکھتے، اور آدمی کو اس سے بے گانہ محض بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ انسان اُس حق سے، جس کے ساتھ اس کی اصل فطرت کو وہی تعلق ہے جو تعلق متناہیس سے صاف ہو ہے کو ہوتا ہے، یوں اظہارِ بیزاری کرتا چنانچہ ان افراد کا حال بالکل دوسرا رہا جو اگرچہ جاہلیت کے اندھیرے میں گم پڑے تھے، مگر ان کے دلوں میں ابھی زندگی باقی تھی اور ان کی فطرت قبول کی صلاحیت سے ہنوز محروم نہیں ہوئی تھی۔ جب حق کی روشنی پھیلی تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ جس کے بعد نہ جاہلی معاشرے کا بندھن اٹھینا پڑا کر رکھ سکا اور نہ ان کے ذاتی مصالح و مفادات ان کے پاؤں کی پٹری بن سکے، حتیٰ کہ وقت کا اقتدار بھی انھیں اپنے فیصلے سے باز نہ رکھ سکا۔ معاشرے نے جب دباؤ ڈالا تو ان کا

جواب تھا ”وَمَا رَبِّي إِلَّا عَبْدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَالْيَسِيرُ مُرْجَعُونَ“۔ لیس ۲۲۔  
 (آخر میں اس خدا کی بندگی کیوں نہ کروں جس نے مجھ پیدا کیا ہے اور اسی کے پاس تم سب کو بھی  
 لوٹ کر جانا ہے؟) اور جب ظالم اقتدار نے سولی پر چڑھا دینے کی دھمکی دی تو اس کی آنکھوں  
 میں آنکھیں ڈال کر بولے ”فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ“۔ (جو کچھ تجھے کرنا ہو کرے)  
 انبیاء علیہم السلام کے سارے جتن کے باوجود اور بتن سے بتن آیات دیکھ لینے کے بعد بھی  
 جاہلیت کے بدستور گرویدہ بنے رہے تو صرف وہ بد بخت جن کے اندر ذوقِ حق طلبی کا شائبہ  
 بھی باقی نہیں رہ گیا تھا اور جنہوں نے انسانیت اور نفسانیت کو ہم معنی سمجھ رکھا تھا۔

### بَدَأَ الْإِسْلَامَ غُرُوبًا

ساتویں صدی عیسوی کا آغاز تھا کہ ہدایتِ ربانی کا آخری نزول شروع ہوا، اور حضرت  
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری پیامبر کی حیثیت سے مبعوث ہوئے روقت کے پردوں  
 پر دعوتِ حق کے سلسلے میں وہی مناظر پھر پھر نے لگے جو ایسے مواقع پر ہمیشہ ابھرتے رہے  
 ہیں، چونکہ آپ کی نبوت نہ صرف یہ کہ دائمی تھی بلکہ عالمی بھی تھی، اس لئے اب کی بار اسلام  
 اور جاہلیت کا ٹکراؤ بھی غیر معمولی حد تک سخت اور وسیع رہا۔ اگرچہ دنیا اپنی ذہنی نشوونما کے  
 اعتبار سے اب سنِ رشد کو پہنچ رہی تھی مگر حق سے اس کی بے رغبتی اور باطل سے ذوق  
 وابستگی میں کوئی فرق نہ ہونے پایا تھا۔ اس لئے آپ کی دعوت کا بلند ہونا تھا کہ ٹھیک وہی  
 طوفانِ طغیان ہو جو انبیاءِ دُعووتوں کے خلاف اٹھتا رہا ہے، حق کی تردید کے لئے جاہلیت  
 اپنی بیاض استدلال، کھول کر بیٹھ گئی اور آپ کی نبوت کے خلاف یہ دلیل پڑھ کر سنا دی۔

أَبْحَثَ اللَّهُ لِبَشَرٍ أَسْوَلاً      کیا اللہ نے ایک بشر کو اپنا فرستلا

(نبی اسرائیل ۹۴)      بنایا ہے؟

اور:-

عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ      اس بات پر وہ متعجب ہو رہے کہ اپنی

مِنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُونَ  
هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ

کے اندر سے ایک خبردار کرنے والا ان  
کے پاس آیا ہے چنانچہ ان منکروں  
نے کہا کہ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

(ق-۲)

جہاں کسی پر شبہ ہو کہ یہ حضورؐ کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے قوم کے بڑوں نے اسے  
شرم دلاتے ہوئے کہا:-

إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا مَحْبِلًا  
مَسْكُورًا (بنی اسرائیل-۴۴)

تم تو ایک آسیب زدہ کے پیرو  
بننا چاہتے ہو

اور جب آپؐ کی زبان سے قرآن سنتے تو اس پر توجہ کرنے کے بجائے تیز تیز لگا ہوا  
سے آپؐ کو اس طرح گھورنے لگتے گویا آپؐ کے قدم پچلائے بغیر نہ رہیں گے (إِنْ يَخْلُدُ  
الَّذِينَ كَفَرُوا لَيَقْوُنَا بِأَبْصَارِهِمْ قَلَمًا - ۵۱) اور کہتے یہ تو نرادلوانہ ہے  
إِنَّا لَمَجْنُونٌ - ایضاً) توحید کے خلاف یہ دلیل پیش کی گئی:-

أَجْعَلِ الْآلِهَةَ إِلَّا اللَّهًا  
وَأَعِدَّ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ  
عَجَابٌ (ص-۵)

کیا اس شخص نے سارے معبودوں کی  
جگہ ایک ہی معبود بنا ڈالا ہے؟ یہ تو بڑی  
عجیب چیز ہے۔

اور پھر علیؑ رویہ یہ اختیار کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں کان میں پڑتے ہی منہ موڑ کر  
بھاگ کھڑے ہوتے (وَلَوْ أَعْلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُوسًا - بنی اسرائیل-۴۶)  
آخرت کی بات سنتے ہی آپؐ کو ایک انوکھا اور حیرت انگیز تاثرہ قرار دے کر ایک  
دوسرے سے کہنے لگا:-

هَلْ نَدَّبَكُم عَلَىٰ رَجُلٍ  
يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مَرَّ قَوْمٌ كَلِمًا  
مَسْرُوقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ  
جَدِيدٍ (سبا-۷)

کیا ہم تمہیں ایک ایسے شخص کو بتلاؤں جو  
خبر دیتا ہے کہ جب تم لوگ گھل سڑ کر  
ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو از سر نو پیدا کئے  
جاؤ گے؟

اور بار بار اس کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔ کبھی سر ہلا کر کہا جاتا "آخر وہ کب برپا ہوگی؟" (دستی ہو۔ بنی اسرائیل۔ ۵۱) کبھی پوچھا جاتا "وہ کب آکر ننگر انداز ہوگی؟" (آیات مرساھا نازعات۔ ۴۲) غرض ان ماضی پرستوں، حال کے شدید ایوں اور مستقبل سے غافلوں کے نزدیک دعوتِ حق کی بنیادوں میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو بدانتہ غلط نہ ہوتی اور جو قابلِ تعجب ہی نہیں لائقِ استہزاء بھی نہ ٹھہرتی اور جس پر لمحہ بھر بھی ٹھہر کر غور کیا جاسکتا۔ ہرنیلو ایک عجوبہ اور اس کی ہر دلیل دیوانے کی بر تھی۔ آپ کے نبی ہونے پر تعجب کا اظہار اور اس کا استہزاء تو حید کے عقیدے پر تعجب کا اظہار اور اس کا استہزاء آخرت کی بات پر تعجب کا اظہار اور اس کا استہزاء۔ اور جب اس دین کی ساری کی ساری بنیادیں محلِ تعجب اور لائقِ استہزاء ٹھہرا دی گئیں تو ان بنیادوں پر تشکیل پانے والے پورے نظامِ ہدایت کا ایک ایک جزو ان کے لئے قدرتی طور پر ناقابلِ فہم ہونا چاہئے تھا، اور جیسا کہ آگے چل کر آپ تفصیل سے پڑھیں گے، فی الواقع ایسا ہی ہوا بھی حضورؐ کی اور آپ کے اصحاب کی مسلسل کوششوں اور تفہیموں کے باوجود نہ تو اس دین کا تصویر ہی انہیں اپیل کر سکا، نہ اس کے معیارِ غیرِ بشر سے وہ مانوس ہو سکے، نہ اس کی اخلاقی قدروں کے رحر شناس بن سکے اور نہ اس کے احکام کی حکمتیں اور مصلحتیں ان کی سمجھ میں آسکیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضورؐ ان کی نظر میں اس دنیا کی مخلوق تھے ہی نہیں نہ آپ کی کوئی بات انسانی عقل کے لئے قابلِ فہم تھی۔ آپ کے لئے ہونے دین کے مطلوبہ ذہنی سانچے سے راجح الوقت اندازِ فکر و نظر کی بے گانگی کی انتہا، یہ تھی کہ جاہلیت کے اندھے پرستاروں کا معاملہ تو الگ رہا، ان پیروانِ حق کو بھی جو جاہلیت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکل آئے تھے اور جنہیں توحید، آخرت، رسالت، قرآن اور اسلام پر پورا پورا شرح صدر حاصل ہو گیا تھا۔ اس دین کے تفصیلی تقاضوں کو مفہم کر لینے میں قدم قدم پر مشکلات پیش آتی رہیں، اور اس کی فکر کی بے نظیر بلندیوں کے سامنے وہ بھی باز بار ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے رہے۔ اور برسوں کی تربیتی کوششوں کے بعد ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ذہنوں کو پوری

طرح صاف کر سکے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ کے یہ وہ حقائق ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تین لفظوں کے ایک مختصر سے بلیغ جملے میں یوں بیان فرمایا ہے:

بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا      اسلام کا آغاز ایسی حالت میں ہوا تھا  
(مسلم، جلد اول، باب ان الاکلام بربکما)      کہ وہ (دنیا کے لئے) غریب تھا۔

’غریب‘ کے معنی عربی زبان میں اس معنی سے بہت کچھ مختلف ہیں جو اس لفظ کے اردو زبان میں ہیں۔ اردو میں ’غریب‘ کے عام اور مشہور معنی مفلس اور نادار کے ہیں، اور کبھی کبھی ’مسافر‘ کے معنی میں بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس کے معنی مفلس اور نادار کے تو بالکل نہیں ہیں البتہ مسافر کے صرور میں۔ مگر یہ معنی بھی فی الواقع مجازی ہیں، حقیقی نہیں ہیں۔ حقیقی معنی اس لفظ کے نرالے، بیگانے اور اجنبی ذمما نوس کے ہیں۔ اور یہی اصل معنی اس ارشاد نبوی میں مراد ہیں، ’مسافر‘ کے معنی اس لئے مراد نہیں ہو سکتے کہ ایسی شکل میں نہ تو اس ارشاد کے اندر کوئی خاص معنویت پیدا ہو سکتی ہے نہ ادب کا ذوق ہی اسے تسلیم کر سکتا ہے۔ پھر ’غریب‘ کے معنی اگر مسافر کے ہوتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ ایک اجنبی ماحول میں ہوتا ہے اور وہاں کے لوگوں کو اس سے کوئی بگانگی، کوئی انس اور کوئی جان پہچان نہیں ہوتی۔ لیکن اصل اجنبیت اور بے گانگی شکل صورت، وضع قطع اور طبعی تعلق کی نہیں بلکہ افکار و نظریات، پسند و ناپسند اور مذاق و مزاج کی ہوتی ہے۔ ایک آدمی اپنے ہم وطنوں اور خوئی رشتہ رکھنے والوں کے اندر رہتے ہوئے بھی بیگانہ سے بے گانہ تر ہو سکتا ہے اگر اس کا ذہن ان کے ذہن سے کوئی لگاؤ نہ رکھتا ہو اور اس کے افکار و تصورات ان سے بالکل مختلف ہوں۔ پس اسلام کے ’غریب‘ ہونے کا مطلب جس طرح یہ نہیں ہے کہ جب اس کی ابتدا ہوئی تھی اس وقت اس کے عملی معنی افلاس کے تھے اور اس کے ماننے والے سب کے سب مفلس تھے، اسی طرح یہ بھی نہیں ہے کہ اسلام کی ابتدا مسافرت یا خانہ بدوشی کی حالت میں ہوئی تھی، بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ جب وہ آیا تو اپنی خالص



عقلیت اور بے آمیز فطرت، اپنے عقائد اور تصورات، اور اپنی اقدار و مہنیات کے اعتبار سے اس دنیا کے لئے بالکل نرالا، سراسر اجنبی اور کیسے پرکھا نہ تھا جو نفسانیت، مادیت، فکر و نظر کی پستی، عقلی فساد، خود ساختہ رسوم اور باپ دادا کی اندھی تقلید کے شدید ایڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی ایک ایک بات سے لوگوں کو وحشت ہو رہی تھی، ہر چیز ان کو ادبیری اور ناقابل فہم، عجیب اور حیرت انگیز معلوم ہو رہی تھی۔ ان کے ٹیڑھے اور تنگ مانگوں میں اس ماورائی، وسیع بلند اور پاکیزہ نظام ہدایت کا تصور کسی طرح سما تا ہی نہ تھا جو اسلام نے پیش کیا تھا۔ جس طرح گول خانے میں چونکھی چیز گھس نہیں پاتی اسی طرح ان کے اوندھے ذہنوں میں دعوتِ حق کی باتیں انہیں پانی نہیں، اور جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کونیم کے پتوں کی کڑواہٹ محسوس نہیں ہو پاتی اسی طرح ان جاہلیت کے ڈسے ہوئے کی عقل بھی کفر، شرک، فسق، مادیت، نفسانیت اور بدینیت کی تلخی کا احساس کھو بیٹھی تھی۔

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کے تازہ انگریزی کتابچے۔

- |  |     |
|--|-----|
| (1) ISLAM — THE UNIVERSAL TRUTH              | 3/- |
| (2) ISLAM AND THE UNITY OF MANKIND           | 3/- |
| By. Maulana Syed jalaluddin<br>Umri.         |     |
| (3) PITFALLS ON THE PATH OF ISLAMIC MOVEMENT | 4/- |
| (4) HOW TO STUDY ISLAM?                      | 3/- |

By Maulana Sadruddin Isfahi

یہ کتابچے ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔